۷۸۶

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ

صدر محترم، مشائخ عظام و علماء کرام

اور معزز حضرات!

میں اپنے موضوع کے متعلق چند گذارشات ہی پر اکتفا کروں گا۔ چونکہ یہ گذارشات ہمارے علمی پس منظر اور ہمارے سلف صالحین کے لائحہ عمل اور ہمارے تعلیمی مقاصد کے بیان پر موقوف ہیں۔ اس لئے میں پہلے اس پس منظر کو عرض کرتا ہوں، جو ہر کیف ہمارے لائحہ عمل میں ملحوظ ہونا چاہیئے۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ :-

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ڈاکٹر ہالیپونا صاحب

پاکستان کے ترقی پذیر معاشرے کیلئے ایک تعلیمی لائحہ عمل

پاکستان ایک ترقی پذیر معاشرہ ہے | پاکستان کا معاشرہ ایک ترقی پذیر معاشرہ ہے کیونکہ اسکی بنیاد اسلامی عوامل اور اقدار پر رکھی گئی ہے اور اسلام انسانی فرد اور معاشرے کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے ایک دائمی مشعل راہ ہے۔ جو معاشرہ اسلامی طرز زندگی پر گامزن ہوگا وہ ضرور ترقی پذیر ہوگا اور اس کی ترقی صحیح راہ پر ہوگی۔ اور اس کی ترقی ہر پہلو میں صحیح کمال کی طرف ہوگی نہ کہ محض نام نہاد ترقی جس کے باطن میں تنزل اور انحطاط کا بیج مضمر ہو۔ تاریخ اسلام اس حقیقت کی شاہد ہے کہ اسلامی معاشرہ ہر دور میں ترقی پذیر رہا ہے۔ اس قدر کہ وہ تمام عالم میں صحیح راہ پر ترقی کرنے میں تمام قوموں سے پیش پیش رہتے ہوئے زندگی کے روحانی، مادی، انفرادی، اجتماعی، سیاسی اور ملی زاویوں میں، دیگر اقوام کے لئے مشعل راہ رہا ہے۔ جس طرح مسلمان زندگی کے ہر شعبہ میں ممتاز رہے ہیں اسی طرح تعلیم و تعلّم، تحقیق و تدقیق اور تالیف و تصنیف میں بھی تاریخ کے ہر دور میں (یورپ کے تسلّط سے پہلے) وہی پیش پیش رہے ہیں۔

تصنیف و تالیف | تصنیف و تالیف کا یہ عالم تھا کہ علوم و فنون کا کوئی بھی ایسا شعبہ نہیں ہے۔ جس میں مسلمانوں نے اپنے تحقیقی و علمی شاہکار نہ چھوڑے ہوں ان تصنیفات اور تالیفات کا کچھ اندازہ فہرست ابن ندیم، کشف الظنون اور مقدمہ ابن خلدون کے الباب السادس وغیرہ سے ہوتا ہے۔ اور مزید ان تاریخوں اور انسائیکلو پیڈیاز سے ہوتا ہے۔ جن کا ذکر مولانا محمد عبدالرشید نعمانی نے اپنے تحقیقی مقالہ میں فرمایا تھا۔

مقدمہ ابن خلدون میں جن علوم کا ذکر ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

علم القرأۃ ، علم الفقہ ، اصول الفقہ ، علم الکلام ، علم التصوف ، العلوم العقلیہ ، علوم الادب ، علم ریاضی ، علم الہندسہ ، علم الجبر والمقابلہ ان کے ساتھ انجینیرنگ کے چند علوم جیسا کہ علم المساحت ، علم میکانکی ، اصول علم حلوی ، روشنی اور دوربینی کے اصول وغیرہ انکے علاوہ علم الفلکیات ، علم الطب ، علم الجراحت ، علم زراعت ، علم کیمیا ، علم الطبیعیات وغیرہ علم اللغات اور اس کے متعلق دیگر علوم ، فلسفہ و منطق حتیٰ کہ علم سحر و طلسم کو بھی نہیں چھوڑا ۔

ان علوم کی فہرست سے معلوم ہو گا کہ ابن خلدون کے زمانے تک چودھویں صدی عیسوی کے مصنفین بس سے تھے ۔ مسلمانوں کے ترقی پذیر معاشرہ نے دینی علوم کے ساتھ ہی ساتھ ہر قسم کے علوم عقلی و نقلی ، روحانی و مادّی علوم میں بھی اس قدر ترقی کی تھی جس کی مثال کسی اور معاشرے میں ہرگز نہیں ملتی ۔

علوم کا قرآن سے استنباط ابن خلدون کے بعد پندرھویں صدی عیسوی کے مصنف علامہ جلال الدین السیوطی (۱۴۴۵ء ۱۵۰۵ء) اپنی مشہور و معروف کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں جو علم تفسیر کا ایک بے نظیر مقدمہ ہے ۔ یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ اس زمانے کے لوگ مذکورہ بالا علوم میں سے اکثر علوم کو اور ساتھ ہی ساتھ کا دوسرے علوم کو نہ صرف ہماری اصطلاح کے مطابق اسلامی علوم سمجھتے تھے بلکہ ان علوم کا خود قرآنی آیات سے استنباط بھی کرتے تھے ۔ "الاتقان" میں امام السیوطی نے اس کے متعلق ایک باب لکھا ہے ۔ جس کا عنوان ہے "العلوم التی استنبطت من القرآن" اور اس باب میں جن علوم کی فہرست ہے اُن میں علوم عقلیہ و نقلیہ جو آجکل مدارس میں مروّج ہیں ، ان کے ساتھ ہی ساتھ علم الخطاب ، علم تاریخ ، علم المواقیت ، علم الطب (جس میں آجکل ڈاکٹری شامل ہے) علم الہندسہ و علم الحساب جو انجینیرنگ بھی مشتمل ہے ، علم الجبر والمقابلہ جو آجکل کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے اور بہت سارے علوم جو ٹیکنالوجیکل کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں ۔ وغیرہ بھی شامل ہیں ۔ اور بعض اکابر کا قول نقل کرتے ہوئے سیوطی فرماتے ہیں ۔ کہ قرآن میں علوم بے اندازہ ہیں ۔ جن کے حاصل کرنے کے لئے قرآنِ کریم سے ترغیب و ہدایت ملتی ہے ۔ اسی وجہ سے بعض بزرگوں نے قرآن کے علوم کی تعداد سات ہزار سات سو پچاس بتائی ہے ۔ اور بعض کے نقطۂ نظر سے علوم قرآن کی تعداد ستر ہزار ہے ۔ چنانچہ امام سیوطی یہ لکھ کر کہ قرآن کے علوم اور عجائبات اس قدر وسیع ہیں کہ جن کا احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے تحریر فرماتے ہیں ۔

"وھذا مالا یحصٰی ولا یعلمہ الا اللہ۔ اور فان القرآن لا یستدرک ولا تحصٰی عجائبہ۔ فرماتے ہیں کہ۔ وانا اقول قد اشتمل کتاب اللہ العزیز علیٰ کل شیءٍ۔ اما انواع العلوم فلیس منھا باب ولا مسئلۃ وھی اصل الا وفی القرآن۔"

"میں کہتا ہوں کہ بے شک کتاب اللہ العزیز ہر ایک شے پر مشتمل ہے۔ انواعِ علوم کو لیجئے تو اُس میں کوئی ایسا باب یا مسئلہ جو کہ اصل اصول ہو اس طرح کا نہیں ملتا کہ قرآن میں اُس پر دلالت کرنے والی بات موجود نہ ہو، مثلاً عجائبِ مخلوقات کا ذکر اُس میں ہے، آسمان وزمین کی مخفی تونوں کا بھی اس میں بیان ہے، اُفقِ اعلیٰ و تحت الثریٰ میں جو بات پائی جاتی ہے۔ اُس کے ذکر سے بھی قرآن خالی نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش کا اس میں بیان ہے اور انسان کی موت تک کے حالات وغیرہ کا بھی اس میں بیان موجود ہے۔" بہرکیف قرآن کریم بے اندازہ علوم کا بے پایاں مخزن ہے۔

جدید علوم مسلمانوں کی پیداوار ہیں

جن علوم کو ابنِ خلدون نے اور علامہ سیوطی نے اپنی تصنیفات میں بیان کیا ہے۔ اُن میں سے اکثر کو آج کل عام طور پر جدید علوم میں شامل کیا جاتا ہے۔ اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ جدید علوم اور سائنس اور وہ علوم جن کو سائنس کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے سب یورپ کی پیداوار ہیں۔ اور جو لوگ کہتے ہیں کہ یہ علوم قرآن سے مستنبط ہیں یا اِن علوم کا مسلمانوں اور اسلام سے تعلق ہے۔ تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ فقط ایک مبالغہ اور تصنع ہے جو شائقینِ اسلام، یورپ کی ترقی پر رشک کر کے اُن کے علوم کو اپنانے کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ جب ابنِ خلدون نے مقدمہ لکھا تھا اور علامہ سیوطی نے "الاتقان" کی تصنیف کی تھی اُس وقت نہ یورپ عروج پر تھا نہ انگریز برسرِ اقتدار تھے در اصل یہ قرآنی تعلیمات کا اثر تھا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں اس قدر علوم کی وسعت ہوئی اور اس قدر علوم وفنون پھلے پھولے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جن علوم کو آجکل سائنس میں شمار کیا جاتا ہے۔ انکی ایجاد کا سہرا ابھی مسلمانوں کے سر ہے۔ اس کی تائید تاریخ کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔ خود

علامہ اقبال نے اپنی کتاب "تشکیل الہیات اسلام" میں ایک یورپین مورخ بریفو کے حوالے سے ثابت کیا ہے کہ سب سے بڑا احسان جو یورپ پر مسلمانوں نے کیا تھا وہ یہ تھا کہ انہوں نے سائنس کو ایجاد کیا۔ ایک امریکن مورخ "ڈریپر" اپنی کتاب میں جو اُس نے یورپ کے ذہنی ارتقاء پر لکھی ہے۔ فرماتے ہیں۔

"قرآنِ کریم نے ایشیاء اور افریقہ پر احسان یہ کیا کہ اُن کو تین چیزیں تمدّن، دین اور علم (سائنس) عطا کیں۔ یورپ پر قرآن کا یہ احسان ہے کہ اُس کو دو چیزیں عطا کیں۔ تمدّن اور سائنس۔"

حقیقت یہ ہے کہ یورپ، اسلام اور قرآن سے پہلے ایک عمیق ترین تاریکی کے دور سے گذر رہا تھا اور اسلامی اثرات کی وجہ سے ہسپانیہ، قسطنطنیہ اور صلیبی معرکوں کے ذریعے اُسکو علمی شعاعیں پہنچیں۔ اس کے بعد یورپ نے مہذّب ہونے کے طریقے سیکھے اور مسلمانوں کے نقشِ قدم پر قدرے چلنے کی وجہ سے اُس میں ذہنی اور مادّی ترقی ایک حد تک ہوئی۔ پھر بھی انسانیت کے مدارج میں وہ کہیں پیچھے ہیں۔

جارج سارٹن نے اپنی کتاب "مقدمہ تاریخ سائنس" میں مسلمانوں کی سائنس میں تصنیفات اور خدمات پر تفصیل سے بحث کی ہے جس میں عصر جابر بن حیان، عصر خوارزمی، عصر رازی، عصر مسعودی اور عصر بیرونی، عصر عمر خیام اور عصر ابنِ رشد اور عصر ابنِ خلدون کی تفصیلات میں بہت سے مسلم سائنس دانوں کا ذکر ہے۔ جنہوں نے تمام عالم میں اپنے علوم کے فیض سے مختلف قوموں کو فیضیاب کیا۔

سائنسدان اور علماء مدارس کی پیداوار تھے

یہ مسلم مصنفین اور ماہرین ظاہر ہے کہ اُس زمانے کی تعلیم و تربیت سے مستفیض ہوئے۔ اور اپنے دور کے مدارس و تعلیم گاہوں میں اپنے استادوں کی زیرِ نگرانی ان کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ اُس دور میں قرآن و حدیث کی تعلیم کے ساتھ ہی ساتھ دوسرے علوم میں بھی تربیت دیجاتی تھی اور اسی تربیت کی وجہ سے مختلف علوم کے ماہرین اور مصنفین اور سائنسدان پیدا ہوئے اور اس دور میں تعلیم میں اِس قسم کی

مدارس کے نصاب میں علوم کی تفریق نہیں تھی

تقسیم اور تفریق مروّج نہیں تھی کہ دینی علوم، اِس قدر طبعی اور دیگر معاشرتی علوم سے الگ کر دیئے جائیں کہ ایک کا دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہ رہے اور ایک کو خالص دینی سمجھا جائے اور دوسرے کو خارج از دین یا غیر دینی سمجھ کر نظرانداز کر دیا جائے۔

کیونکہ یہ تفریق صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے خارج ہے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں۔ کہ انگریزوں کی آمد سے پہلے مدارس میں جو تعلیمی نصاب رائج تھا۔ اس میں دینی تعلیم یعنی قرآن و حدیث اور عربی لغت وغیرہ کے ساتھ دوسرے علوم معاشرتی اور اقلیدس، علم الحساب، طبیعیات، الٰہیات، قانون (فقہ) اصولِ قانون، تاریخ، جغرافیہ، علم الاخلاق، علم السیاسیات، علم الاکتساب، علم النفس، علم الطب (مع علم کیمیا) وغیرہ شامل تھے۔ اگرچہ بعض ادوار میں ان علوم کی مفصل تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ بعض علوم تو کتب متون کے مختلف ابواب تک ہی محدود تھے لیکن اگر ان مدارس کی تعلیم کی تحلیل کی جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ اسکے وقت عام مدارس کا وہی منصب تھا جو

مدارس و دارالعلوم کا منصب یونیورسٹی کا تھا

اس وقت کے عام کالجوں اور یونیورسٹیوں کا ہے۔ اگر کوئی فرق ہے تو فقط یہ فرق ہو سکتا ہے کہ اس وقت کے مدارس میں دینی تعلیم کو اہمیت دی جاتی تھی کم از کم اس سے زیادہ جو دورِ حاضر کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دیجاتی ہے۔

ان مدارس کے فارغ التحصیل ہی مناصب پر فائز ہوتے تھے

اور یہ بھی واضح ہے کہ گذشتہ دور کے مدارس سے جو تعلیم پاکر نکلتے تھے وہی جاکر حکومت کے مختلف منصبوں پر فائز ہوتے تھے اور ان میں ہی سے انجینئر بنتے تھے اور ان ہی میں سے آفیسر، ان ہی میں سے وزراء، اور ان میں سے ہی محاسب و مرزبان بنتے تھے اور ان میں ہی سے فقہا، علماء اور شعراء، کتّاب، حفاظ، شیوخ، وصوفیا، فیلسوف، اطباء، علوم طبیعیات کے ماہرین اور مہندس، حکماء، فلکیات کے ماہرین وغیرہ، یہ سب کے سب ایک ہی تعلیمی نظام کی پیداوار تھے۔ اب آپ اسکو اسلامی نظام تعلیم کہیں یا مسلمانوں کے نظام تعلیم سے تعبیر کریں۔

اسلامی نظریۂ تعلیم

دراصل بات یہ ہے کہ اسلامی نظریۂ تعلیم کا دارومدار چند اصولوں پر ہے۔ اگر وہ اصول قائم ہیں تو شعبۂ تعلیم اور فن کوئی بھی ہو۔ خواہ مادّی ہو یا روحانی، انفرادی ہو یا اجتماعی، عقلی ہو یا نقلی، اسلامی نظام تعلیم میں سمویا جا سکتا ہے۔ اگر ان اصول میں خلل پیدا ہو جائے تو ظاہری نام نہاد روحانی تعلیم بھی قابل حذر ہو جاتی ہے۔

سعادت حقیقی

اسلامی اصولِ تعلیم یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ اور فرد بقید حیات اس طرح ترقی پذیر ہو جس سے اس کو سعادتِ حقیقی حاصل ہو، سعادت حقیقی یہ ہے کہ اس میں انسانی قوتیں باقاعدہ مکمل ہو جائیں اور نشوونما حاصل کریں۔ تاکہ انسان صحیح معنوں میں انسان ہو جائے اور انسانی معاشرہ صحیح معنی میں صالح لوگوں کا معاشرہ ہو یہ سب کچھ تب ہو گا جب انسانی

ذہن اور باطن کا رخ للّٰہیّت کی طرف ہو اور احساسِ ربوبیت سے بھرپور ہو۔

مادّی اور روحانی پہلوؤں کی جامعیّت

اسلامی تعلیم میں امتیازی بات یہ ہے کہ اس تعلیم کا مقصد نہ صرف زندگی کے مادّی پہلوؤں کی واقفیت پیدا کرنا ہے یعنی کائنات کی اُن چیزوں کی معلومات فراہم کرنا ہے جو مشاہدے، تجربے اور تجسّس سے معلوم ہوتی ہیں۔ بلکہ ساتھ ہی ساتھ اسلامی نظامِ تعلیم کا یہ بھی مقصد ہے اور یہ اہم مقصد ہے کہ اس کے ساتھ زندگی کے دیگر زیادہ اہم پہلوؤں کے بارے میں بھی علم اور تربیت حاصل کی جائے یہ اہم پہلو انسان کی روحانی زندگی ہے۔ اس زندگی کے متعلق معلومات حاصل کرنے اور اس میں تربیت حاصل کئے بغیر انسان صحیح طور پر کامل ترقی حاصل نہیں کرسکتا۔ اور انسان کی سعادت اور بہتری اسی میں ہے کہ مادّی ترقی کے ساتھ روحانی ترقی بھی حاصل کرے۔ چونکہ انسانی تعلیم میں یہ دونوں پہلو ملحوظ ہیں ظاہر کے ساتھ باطن اور مادّہ کے ساتھ رُوح، علم کے ساتھ عمل، مشاہدے کے ساتھ تجربہ غرض دونوں پہلوؤں کا لحاظ کیا گیا ہے۔ اِس لئے اسلامی تعلیم کا نظام زیادہ مکمل اور اتم ہے۔ انسان کے لئے وہی نظامِ تعلیم سب سے زیادہ موزوں مفید اور سب سے زیادہ فطری ہے جو انسان کی فطری ضروریات کو ملحوظ رکھے۔ اسلام دین فطرت ہے اور اسلامی نظامِ تعلیم بھی مبنی علی الفطرت ہے۔ جو فطری ضروریات کو ملحوظ رکھتا ہے اور انسانی فطری ضروریات اور حاجتوں کو پورا کرنا اس کا اہم مقصد ہے۔

شاہ ولی اللہ کا انسانی فطرت کا تجزیہ

شاہ ولی اللہ کے نقطۂ نظر سے اگر انسانی فطرت کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انسان میں نہ صرف مادّہ جسم یا بہیمیت یا ظاہر ہے بلکہ اس کا باطن بھی ہے جس میں اس کے قلب اور عقل کا امتزاج ہے۔ انسانی مزاج کو فطری طور پر کمال پر پہنچانے کے لئے اسلامی نظامِ تعلیم میں انسان کی فطرت اور مزاج کے ہر پہلو کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ پھر اس میں ہر قسم کے علوم داخل ہیں انسان کی عقل کو وسیع کرنے کے لئے علوم عقلیہ ہیں اور قلب کو جو جذبات و لطائف اور روحانی واردات کا ایک مرکز ہے، روشن کرنے کے لئے الہامی اور روحانی علوم کا سلسلہ ہے ساتھ ہی ساتھ انسان کے مادّی پہلو اور طبیعیت اور بہیمیّت کی علمی و عملی تربیت کا سامان بھی مہیّا ہے۔ اور مادّی علوم میں تجسّس اور تحقیق بھی مختلف پہلوؤں سے ایک اہم نتیجہ سرانجام دیتا ہے۔ جس سے انسان کی مادّی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ اور اسلامی نظامِ تعلیم میں چونکہ روحانیت کا پہلو غالب ہے اِس لئے للّٰہیّت کا جذبہ پیدا کرنا سب سے اہم مقصد ہے۔ مسلمان یہ مقصد ہر قسم کے مطالعہ اور تجزیہ سے حاصل کرلیتا ہے۔ خواہ وہ روحانیت کے مطالعہ میں مشغول ہو خواہ وہ کائنات کے

مادّی پہلو میں کیونکہ کائنات کی ہر چیز میں خالق، پالن ہار کی ربوبیت کا فیض جاری ہے۔ ہر چیز اُسی پروردگار عالم کی ربوبیت کے جلوے کے طفیل موجود ہے اور ہر شے اُسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک مشیّتِ ایزدی کا اس سے تعلق ہے۔ اِسی لئے مسلم سائنسداں صحیح معنی میں عالم اور سائنسداں تب ہوگا جب وہ سائنٹفک مواد کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی محسوس کرتا رہے کہ ہر سائنٹفک اصول اور قانون، الٰہی قانون کا جزء ہے۔ ہر چیز کا وجود خواہ وہ طبیعیات کے زمرے میں ہو یا الکیمیا کے علم کے احاطے میں یا حیاتیات میں یا نباتیات میں ہو سب باری تعالیٰ کی خالقیت اور ربوبیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور یہ نسبت کبھی بھی اُن کے ذہن سے زائل نہیں ہوتی۔ اسلامی نظامِ تعلیم میں ذکرِ ربّ باری تعالیٰ قائم رہتا ہے۔ ہر چیز کا اصلی رشتہ اشیاء کے خالقِ حقیقی اور ربّ العالمین کے ساتھ ذہن کے سامنے رہتا ہے۔ اِس لئے الحاد، لادینیت اور دہریت کی گنجائش نہیں رہتی۔ بلکہ اِس نظام کے مطابق مادّیات کا مطالعہ اور غور و فکر ایمان تازہ کرتا ہے اور مضبوط بناتا ہے۔ جس طرح امام غزالی نے "المنقذ من الضلال" میں جانوروں کے جسم کی بناوٹ کا علم حاصل کرنے کے متعلق فرمایا ہے۔

(۱) قرآنِ کریم کی سب سے پہلی نازل شدہ آیت "اقرأ باسم ربّك الذی خلق" کے حکم کی تعمیل میں مسلمانوں کو اس طرح پڑھنا اور کائنات پر غور کرنا ہے کہ پڑھنے اور غور کرنے کے ساتھ یہ بھی احساس ہوتا جائے کہ ہر آن اور ہر لمحہ تربیت دینے والا وہی ہے جو پیدا کرنے والا ہے۔ اس احساس کے ساتھ زندگی کے مختلف شعبوں پر غور و فکر اور تجسّس و تحقیق کرنا ایک طرف نفس الامر کے مطابق اور دوسری طرف انسان کی علمی، ذہنی، عقلی، روحانی، مادّی، انفرادی اور اجتماعی ترقی کے لئے ممد ہے۔ یہ تھا ہمارے تعلیمی لائحہ عمل کا دینی اور تاریخی پس منظر۔

(۲) اب پاکستان کے ترقی یافتہ معاشرہ کے لئے تعلیمی لائحہ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ سب علوم خواہ وہ کالجوں میں پڑھائے جائیں یا یونیورسیٹوں میں، ان کو اسلامی علوم کے دائرے سے خارج نہ سمجھیں۔ اور یہ تفریق جو انگریزوں نے اسلامک اسٹڈیز کی اصطلاح چند علوم کے لئے متعیّن کر کے کالج اور مدرسوں میں پیدا کر دی تھی اُس کو ختم کیا جائے۔

(۳) جو یورپین تعلیمات، نظامِ تعلیم اور غیر مسلم حکومت کے تسلّط کی وجہ سے اور جو خامیاں ہمارے تعلیمی نصاب میں داخل ہو چکی ہیں۔ اُن کا ازالہ کرنے کے لئے وہ اقدام کریں جس سے مدارس اور کالجوں میں تعلیمی نظام اسلامی نظام کے مطابق ہو جائے۔ ان سب کو ایک ہی نظامِ تعلیم

کے مختلف ادارے سمجھا جائے۔ جو مختلف مضامین تخصص کی تعلیم سرانجام دے رہے ہیں۔

(۴) ہر کالج میں جو بھی علوم پڑھائے جاتے ہیں۔ اُن میں مسلمان مصنفوں کا جو ورثہ ہے۔ اُس سے طلبہ کو روشناس کراتے ہوئے قانونِ فطرت اور ربوبیت باری تعالیٰ کا گہرا احساس ہر شعبے کے مطالعہ میں پیدا کیا جائے۔ خواہ وہ شعبۂ طبیعیات کا ہو یا الکیمیا کا یا فلکیات یا نباتیات کا کوئی بھی ہو اور نصابی کتابوں میں اِس نقطہ کا خاص لحاظ رکھا جائے اور اسی نقطے سے سائنس کی کتابیں لکھی جائیں اور اسی نقطۂ نظر سے کتابوں کی توسیع کی جائے اور ساتھ ہی ساتھ دینی تعلیم یعنی تعلیماتِ قرآنِ حکیم اور اسوۂ حسنہ کو بھی کالجوں اور اسکولوں میں لازمی قرار دیا جائے۔ خواہ وہ فنون کا ادارہ ہو یا سائنس کا یا انجینئرنگ کا یا ٹیکنالوجی کا۔

(۵) اس طرح مدرسوں اور دارالعلوموں میں دینی علوم کے ساتھ معاشرتی علوم اور سائنس کا نصاب پڑھایا جائے۔ جس طرح اس جامعہ میں ہو رہا ہے۔ لیکن سائنس کی کتابوں کے مضامین کی اس حد تک تصحیح کی جائے کہ ہر قارمولا، ہر جزوی الٰہی قانون اور قانونِ فطرت باری تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ کر کے بتایا جائے۔ اس طرح نہ ہو کہ ایک ساری بیس سو صفحات کی کتاب مخلوقات کے بیان میں ہو لیکن خالق کی نسبت ایک جگہ اشارہ بھی نہ مل سکے۔ بلکہ کتابیں اس طرح لکھی جائیں جس طرح ہمارے سلف صالحین لکھتے تھے۔ کتاب کے شروع میں بسم اللہ اور الحمد للہ لکھتے تھے۔ ورنہ کل امرذی بال لم یبدء ببسم اللہ فھو اقطع کا مصداق ہوں گی۔

(۶) اساتذہ اخلاقِ حسنہ اور دینداری کے اچھے نمونے ہوں جن سے شاگردوں طلبہ و طالبات کی ذہنی و اخلاقی تربیت صحیح نمونے سے ہو۔

(۷) ہماری تعلیم میں قومی تعلیمی کمیشن نے جو مقاصد اور اغراض متعین کئے ہیں اور جو ہدایات صدرِ محترم عالیجناب محمد ایوب خان نے تعلیمی کمیشن کے ممبران کو دی ہیں جو کمیشن کی رپورٹ میں شائع ہو چکی ہیں اُن سب کو بھی ملحوظ رکھا جائے اور اُن کے مقاصد کے حصول کیلئے تعلیمی اداروں میں سعی کی جائے کیونکہ ان سب ہدایات کا مقصد یہی ہے کہ اس پاکستانی معاشرہ کیلئے اسلامی اقدار پر مبنی نظامِ تعلیم مکمل کیا جائے۔

(۸) تعلیمی اداروں میں شعائر اللہ کی تعظیم اور ہمارے اسلامی اور ملّی نظام کی اہمیّت ذہن نشین کی جائے۔

(۹) ہمارے تمام درسی ادارے خواہ وہ مدارس ہوں یا اسکول، کالج ہوں یا یونیورسٹیاں، سب کا نصب العین یہ ہو کہ ایسی متوازن تعلیمیافتہ ہستیاں پیدا کریں جن کے مزاج میں اسلامی اقدار کا صحیح ذوق روحانیت اور ذہنی تیقظ اور معاشرتی علوم کی واقفیت اور اسلامی ضروری احکام سے روشناسی اور ہمارے قومی و ملّی نظام میں خدمتگذاری کی استطاعت اور قوت ہو اور ہمارے تمام تعلیمی اداروں سے خواہ وہ مدارس ہوں یا جامعات یا یونیورسٹیاں، سب سے ایسے افراد نکلیں جو ہماری قومی زندگی کے ہر شعبہ میں حصّہ لے سکیں۔ مدارس کے تعلیمیافتہ علوم دین کے ماہر ہوں لیکن ساتھ ہی ساتھ اُن میں یہ بھی استطاعت ہو کہ ہماری حکومت کے مختلف شعبوں میں اور ہمارے اقتصادی اداروں میں ذمہ دارانہ عہدوں کو بخوبی انجام دے سکیں۔

(۱۰) مدارس اور کالجوں کے طلبہ کے ساتھ جو اس وقت امتیازی برتاؤ کیا جاتا ہے اُس کو ختم کرنا چاہیئے اور اس کی بجائے صحیح معنوں میں علمی وسعت اور لیاقت و قابلیت کو ملحوظ رکھکر فارغ شدہ طلبہ اور اساتذہ کی قدر و منزلت کو صحیح مقام پر رکھا جائے ـــــ مدارس و دار العلوم اور یونیورسٹیوں میں ہمارے قدیم علوم اور علمی ورثے کی حفاظت اور اُن پر تحقیق و تدقیق کرنے کے لئے مواقع فراہم کئے جائیں اوسط درجہ کے ذہنوں کے لئے سہل تعلیمی نصاب کے ساتھ اعلیٰ نصاب کو برقرار رکھا جائے تاکہ اُن کی تحقیقی صلاحیتیں اُجاگر ہوں اور ہمارے اعلیٰ اور ادق کتابوں پر تدقیق کی جاسکے اور ہماری قومی و ملّی اور علمی میراث میں اضافہ ہو جائے۔ یہ علمی تحقیقات ہر شعبہ میں ہونی چاہئیں، خواہ وہ لغت ہو یا نحو و صرف کا شعبہ منطق ہو یا فلسفہ، تفسیر ہو یا معانی، فقہ ہو یا کلام۔ یہ تحریک کہ مشکل کتابیں (مثلاً شرح ملّا جامی، عبد الغفور، خیالی، مبارک اور حجۃ اللہ البالغہ) درس میں سے خارج کر دی جائیں صحیح نہیں ہے۔ یہ کتابیں ہمارا قومی ذخیرہ ہیں ان میں جو علوم ہیں وہ ہمارے سلف کے محققین کی کتابوں کے سمجھنے کے لئے چلا اور ملکہ پیدا کرتے ہیں۔ ورنہ تو حالت یہ ہو گی کہ ایک زمانہ آئے گا جب ان کتابوں کے سمجھنے والا ایک بھی نہ رہے گا اور یہ افسوس کی بات ہو گی کہ ہمارے متقدمین جو ایسی کتابیں لکھ سکتے تھے۔ ہم جیسے متاخرین میں ان کے پڑھنے کی لیاقت بھی نہیں اور نہ اُن سے فائدہ اٹھا کر علمی تجسس کرنے کی استطاعت۔

آخر میں میں اپنے معاشرے کی جماعتوں کی توجہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی کے وصایا کی طرف مبذول کراتا ہوں جن وصایا میں طلبۃ العلم، اساتذہ اور تلامذہ سب شامل ہیں اور فقہاء اور مشائخ بھی امراء، علماء بھی یہ وصایا تفہیمات کی جلد دوم میں ملتی ہیں، آپ حضرات نے دیکھی ہوں گی۔

آپ حضرات ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہ کتاب جامعہ کی لائبریری میں بھی موجود ہے۔ شاہ ولی اللہ اکیڈمی نے بھی اس کو شائع کر دیا ہے۔ ان الفاظ کے ساتھ یہ چند باتیں ہیں جو میں نے عرض کرنے کی جرأت کی ہے۔ براہِ کرم نظرِ رحمت سے معاف فرمائیں۔

آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین۔